بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

حال میں ہمیں ایک ایسے خادم دین سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا جس کے خلوص، سادگی، ان تھک محنت اور نمود و نمائش سے پرے ہنر کو دیکھ کر دل پر خاص اثر ہوا۔ ان کا نام مولانا اے۔ کے۔ عبدالحمید ہے۔ کاریکال (فرنچ انڈیا) کے رہنے والے ہیں۔ پرانے طرز کے عالم ہیں مگر ان کی فقیرانہ سادگی اور سیدھی سادی گفتگو سے کسی کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ علماء کے گروہ سے ہوں گے۔ کئی سال سے خاموشی کے ساتھ ٹامل زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ ان کی محنت شاقہ کے جو نمونے ہم نے دیکھے اُن کو دیکھ کر بے اختیار دل سے نکلا کہ الحمد للہ مسلمانوں میں اب بھی ایسے کام کرنے والے موجود ہیں۔ ٹامل زبان قرآن مجید کی زبان سے بالکل مغائر ہے، اور پھر اسلامی لٹریچر کے لحاظ سے قطعی مفلس بھی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ قرآن کا ایک لفظ بھی ٹامل میں مستعمل نہیں، بلکہ درحقیقت مذہب اسلام کی معمولی اصطلاحات کے لیے بھی اس میں کوئی لفظ نہیں ملتا۔ جنوبی ہند کے مسلمان جو اس زبان کو بولتے ہیں، ان کی اکثریت مذہبی علوم سے قطعی ناآشنا ہے، اور زیادہ سے زیادہ جس مذہبی لٹریچر سے وہ واقف ہیں وہ داستان امیر حمزہ اور ایسے ہی چند افسانوں کے ٹامل ترجمے ہیں۔ ایسی زبان میں قرآن کے معانی بیان کرنا جس قدر مشکل ہوگا اس کا اندازہ ہر صاحب علم کر سکتا ہے۔ مولانا نے اس دشوار کام کو اپنے ذمہ لیا اور ایک ایک حصہ کا ترجمہ کر کے ٹامل جاننے والے علماء کے پاس بھیجا تاکہ وہ لفظ لفظ کو جانچ کر دیکھیں کہ مفہوم ادا کرنے میں کوئی غلطی تو نہیں ہوئی۔ پھر ان کی تجاویز کے مطابق ترجمہ میں اصلاح کر کے ٹامل کے پنڈتوں

سے مشورہ لیا کہ زبان کے لحاظ سے تو کوئی نقص نہیں۔ پھر اسے مختلف عامیوں کے سامنے پیش کیا اور ان سے پڑھوا کر مطلب دریافت کیا تاکہ یہ تحقیق ہو جائے کہ آیا ایک ٹامیل بولنے والا عامی اس ترجمہ کو سمجھ سکتا ہے یا نہیں۔ ان مختلف امتحانات میں جو حصے کامیاب ہوئے ان کو بحال رکھا اور جو ناکام ہوئے ان میں پھر اصلاح کی اور پھر ان کو دوبارہ امتحان کے لیے پیش کیا۔ اس طرح کئی سال کی محنت و کوشش کے بعد وہ قرآن کا ایک ترجمہ کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جس کو بہت سے ٹامیل جاننے والے علماء نے مستند و معتبر قرار دیا ہے۔

ترجمۂ قرآن کا یہ کام ایک حد تک انجام پا چکا ہے اور ابھی ایک معتد بہ حصہ باقی ہے۔ اس کام کی تیاری اور اس کی اشاعت کے تمام مصارف کا ذمہ علاقۂ مدراس کے ایک مسلمان تاجر نے لیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اُس کی مالی حالت خراب ہو گئی اور اب وہ ان کی مدد کرنے سے بالکل قاصر ہے۔ ایسی حالت میں مولٰنا مجبور ہو گئے ہیں کہ اپنا کام ملتوی کر کے روپے کے انتظام کی طرف توجہ کریں۔ ترجمہ کی تکمیل کافی مصارف چاہتی ہے، کیونکہ اس کے مسودوں کو بار بار طبع کرانا پڑتا ہے اور بعض مواقع پر مولٰنا کو خود علماء اور پنڈتوں سے مشورہ کرنے کے لیے سفر کرنا ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد ترجمہ کی اشاعت کے لیے بھی کافی سرمایہ کی ضرورت ہے۔ مولٰنا اس امید کے ساتھ حیدرآباد تشریف لائے ہیں کہ یہاں سے سرمایہ کا انتظام ہو جائے گا، مگر ہم نے محسوس کیا کہ وہ بیچارے ان فنون میں سے کوئی فن بھی نہیں جانتے جن سے سرمایہ حاصل کیا جاتا ہے، اور نہ ان ہتھیاروں سے مسلح ہیں جو روپیہ کھینچنے کے لیے ضروری ہیں۔ نہ ان کے پاس لباس مکر ہے، نہ زبان دراز، نہ تملق اور چاپلوسی، نہ خوشامد اور قصیدہ خوانی، نہ پروپیگنڈا اور گندم نمائی و جوفروشی۔ بلکہ جس سادہ وضع سے وہ تشریف لائے ہیں اس کو دیکھ کر تو ہم کو یہ اندیشہ ہے کہ شائد بڑے آستانوں کے حاجب و دربان ان کے

ساتھ وہی سلوک نہ کریں جس کی شکایت غالب نے کی ہے کہ

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

اسی وجہ سے ہم نے ان کو مشورہ دیا کہ اپنے گوشۂ عزلت میں واپس جائیں اور خدا کے بھروسے پر کام جاری رکھیں، اگر خدا کی بارگاہ میں یہ کام مقبول ہے تو سرمایہ خود ان کے پاس کھینچا چلا آئے گا، البتہ صبر و توکل شرط ہے۔

اسلامی ہند ابھی ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہوا ہے جو تنہا اس کام کا پورا بار سنبھالنے کی استطاعت رکھتے ہوں۔ اگر ایک مالدار شخص کا دیوالہ نکل گیا تو سینکڑوں دوسرے مالدار لوگ بھی موجود ہیں۔ اگر کوئی ایک شخص یہ ہمت نہیں رکھتا تو دس پانچ دولت مند مل کر یہ بوجھ اٹھا سکتے ہیں کمی دراصل روپے کی نہیں بلکہ روپے والوں میں جذبۂ انفاق فی سبیل اللہ کی ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم کس کو دیں، مخلص کام کرنے والے ہی نہیں ملتے۔ مگر جب مخلص کام کرنے والوں کا پتہ ان کو دیا جاتا ہے تو ان کے دل سرد ہو جاتے ہیں۔ یہ کام کرنے والا اُن کو سمجھتے ہیں جو پروپیگنڈا کرتے ہیں، مگر ان کو نہیں معلوم کہ جو پروپیگنڈا کرتے ہیں وہ کام نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک کام کرنے والے وہ ہیں جو اپنے سرپرستوں اور مددگاروں کے نام رسالوں اور اخباروں میں اچھالتے ہیں لیکن ان کو نہیں معلوم کہ نام و نمود اور شہرت کے لیے روپیہ دینا اس کو ضائع کرنا ہے۔ اگر فی الحقیقت خدا پر ایمان اور اس کے اجر پر یقین ہے اور راہ خدا میں کچھ صرف کرنا چاہتے ہو تو ان کو دو جو درحقیقت کچھ کام کرتے ہیں، اور اس طرح دو کہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہونے پائے۔

مولانا عبدالحمید صاحب نے ٹامیل زبان میں ایک مختصر کتاب بھی لکھی ہے جس کا عنوان "دین الفطرت"

ہے۔ اس میں انہوں نے تمدن، معاشرت، معیشت اور سیاست کے مختلف مسائل پر بحث کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام نے جتنے قوانین بنائے ہیں وہ کس قدر فطرت انسانی کے مطابق واقع ہوئے ہیں اور کس طرح دنیا صدیوں کے تجربات اور تلخ تجربات کے بعد آخر کار انہی قوانین کی خوشہ چینی پر مجبور ہوئی ہے اور ہوتی جارہی ہے جن پر کبھی وہ تعصب اور جہالت کی وجہ سے اعتراض کیا کرتی تھی۔ یہ کتاب ٹامیل زبان میں شائع ہوچکی ہے اور اب وہ انگریزی زبان میں بھی اس کا ترجمہ شائع کرنے والے ہیں۔ ہم نے انگریزی ترجمہ کا مسودہ دیکھا اور اس کو ایک دلچسپ اور مفید چیز پایا۔ جنوبی ہند کے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں اس قسم کی کتابیں اگر کثرت کے ساتھ شائع کی جائیں تو ان سے بہت اچھے نتائج حاصل ہونے کی امید ہے۔

اسی زمانے میں ہم کو جناب خلیل انوری صاحب سے بھی نیاز حاصل ہوا جو سنگاپور (جزائر ملایا) سے ایک اعلیٰ درجہ کا انگریزی رسالہ "Genuine Islam" نکالتے ہیں۔ ان کے رسالہ کی تعریف ہم اس سے پہلے ان صفحات میں کرچکے ہیں۔ اپنی شان (Get-up) کے اعتبار سے وہ اس قابل ہے کہ مشرق و مغرب کے بلند پایہ رسائل کے پہلو میں جگہ پاسکتا ہے مضامین کے اعتبار سے بھی خاصا بلند ہے اور زیادہ بلند کیا جاسکتا ہے۔ مگر مشکل یہاں بھی وہی ہے۔ جو دوسرے مفید کاموں کو پیش آرہی ہے خلیل انوری صاحب نے رسالہ اپنے ذاتی سرمایہ سے (جو بہت ہی قلیل تھا) جاری کیا۔ مال دار مسلمانوں میں سے کسی نے ان کا ہاتھ نہ بٹایا۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں نے رسالہ خرید کر بھی ان کی اعانت نہ کی۔ ایک بلند پایہ انگریزی رسالہ کو ایسی حالت میں کیونکر چلایا جاسکتا ہے جبکہ اس کے خریدار پورے ایک ہزار بھی نہ ہوں۔ فاضل موصوف سے ہم نے مسلمانوں کی سرد مہری کا جو حال سنا ہے اس سے ہم حیران ہیں کہ یہ قوم آخر کدھر جارہی ہے اور کیا چاہتی ہے۔ اردو میں لٹریچر پیش کیا جائے تو کہتے ہیں ہمیں انگریزی میں چاہیے۔ انگریزی میں پیش

کیا جائے تو اس کو بھی قبول نہیں کرتے۔ اب غالباً چینی اور ٹیلیگرافی زبانوں کا مطالبہ ہوگا۔ غیر قومیں ہمارے ممالک میں جو رسالے شائع کرتی ہیں ان کی تعداد اشاعت پچاس پچاس ہزار تک پہنچتی ہے۔ پارسی قوم کا ایک اخبار جو گجراتی میں شائع ہوتا ہے ۶۵ ہزار کی اشاعت رکھتا ہے۔ ہندو قوم کا ایک ماہوار مذہبی رسالہ جو ہندی میں نکلتا ہے، چالیس ہزار تک پہنچ چکا ہے۔ انگریزوں اور ہندوؤں کے بعض اخبارات اور رسالے جو انگریزی زبان میں شائع ہوتے ہیں نصف لاکھ یا اس سے کچھ کم و بیش تک اشاعت حاصل کر چکے ہیں۔ مگر مسلمانوں کے بہتر سے بہتر اخباروں اور رسالوں کو بھی ہزار دو ہزار سے زیادہ اشاعت نصیب نہیں ہوتی۔ چار پانچ ہزار تک جو پہنچ گیا اسے گویا معراج حاصل ہوگئی۔ حوصلوں کا یہ حال ہے اور ان کو ہمسایہ قوموں کے مقابلہ میں سربلند ہونے کی آرزو ہے۔

ہم جن اغراض کے لیے Voice of Islam جاری کرنا چاہتے تھے اور اب تک نہ کر سکے، ان کو Genuine Islam بخوبی پورا کر سکتا ہے۔ مسٹر جلیل انوری ارادہ رکھتے ہیں کہ ترجمان القرآن کے خاص خاص مضامین کو انگریزی زبان میں منتقل کریں۔ ناظرین ترجمان القرآن میں سے جو اصحاب انگریزی زبان پر قدرت رکھتے ہوں وہ بھی ضروری مضامین کے ترجمے بھیج کر ان کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کثرت سے اس رسالہ کو خریدیں اور ایڈیٹر کو اس قابل بنا دیں کہ وہ چین اور جاپان اور جزائر ملایا اور مشرق و مغرب کے دوسرے ممالک میں اس آواز کو پھیلا سکیں۔ ایک وسیع حلقۂ اشاعت کے بغیر کسی بلند پایہ رسالہ کو چلانا اور ایک طاقت ور آرگن بنانا جتنا اردو میں مشکل ہے اس سے بدرجہا زیادہ انگریزی میں مشکل ہے۔

ابھی زیادہ دن نہیں گذرے کہ ہم نے علی گڈھ یونیورسٹی کی تعلیم دینی پر کچھ اظہار خیال کیا تھا۔ ممکن ہے کہ اس وقت ہمارے بعض خیالات کو لوگوں نے انتہا پسندی پر محمول کیا ہو۔ مگر حال میں "مسلم

یونیورسٹی کے ایک "مسلم" پروفیسر نے "مذہب" پر توسیعی خطبہ (Extention Lecture) ارشاد فرماتے ہوئے جو گہرافشانی کی ہے وہ غالباً اصحاب ہوش کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہوگی۔ اس خطبہ کی رپورٹ اسٹیٹسمین میں شائع ہو چکی ہے اور اس کے چند فقرے یہ ہیں۔

"انسانی سوسائٹی کے ابتدائی مرحلۂ ارتقا میں وحی بحیثیت ایک اساسِ مذہب کے نہایت کارآمد تھی کیونکہ اس سے تنقید کا سدباب کیا جا سکتا تھا لیکن حق و صداقت کے حصول کا ذریعہ ہونے کی حیثیت سے وہ صرف یہی نہیں کہ ناقابل اعتبار ہے بلکہ فوق الفطری (Super Natural) ہونے کی وجہ سے جدید انسان کو متاثر کرنے میں ناکام بھی ہوتی ہے۔

"جب مذہبی نظریات کو قانونِ علیت (Law of Causality) کے نقطۂ نظر سے جانچا جاتا ہے تو بہت جلدی ان کے پرخچے اڑنے لگتے ہیں"۔

"میرے نزدیک یہ بات واضح ہے کہ اخلاق کو جنت اور دوزخ پر مبنی نہ ہونا چاہیے بلکہ اسے ایک ترقی پذیر سائنس ہونا چاہیے اور عام انسانی ترقی کے ساتھ ساتھ بڑھنا چاہیے"۔

یہ ہے وہ تعلیم جو ہماری یونیورسٹی میں طلبہ کو دی جا رہی ہے اور یہ ہیں وہ مرشدانِ تعلیمی جو علم کے میدان میں ہماری نوخیز نسلوں کی رہنمائی کے لیے منتخب کیے گئے ہیں۔ آپ مسلمان لڑکوں کو خواہ مار مار کر نماز پڑھائیے خواہ نماز نہ پڑھنے پر انھیں رسٹیکیٹ کیجیے، خواہ دینیات لازمہ میں ناکام ہونے پر انہیں امتحانات میں فیل کر دیجیے، لیکن جہاں ان کے دماغوں میں اس قسم کے خیالات بھرے جاتے ہوں وہاں یہ امید رکھنا کہ نمازان کے دلوں میں اتریگی اور دینیات پر وہ سچے دل سے ایمان لائیں گے اور اسلام کی کوئی وقعت ان کی نگاہ میں ہوگی، بالکل فضول ہے۔ ہم یہ بات پہلے بھی کہہ چکے ہیں اور اب پھر کہتے ہیں کہ جس یونیورسٹی میں تمام علوم غیر اسلامی بلکہ اسلام کے مخالف نقطۂ نظر سے پڑھائے جاتے ہوں، اور جہاں دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے پورے ۲۳ گھنٹے طلبہ کو "جدید انسان" بنانے میں

صرف کیے جا رہے ہوں، وہاں ایک چوبیواں گھنٹہ دینیات کی تعلیم کے لیے رکھنا محض تضیع اوقات ہے۔ دینیات کا ایک کورس بدل کر دوسرا کورس رکھ دیجیے اور آسمان سے کسی فرشتے کو بلا کر اس کے پڑھانے پر مقرر کیجیے تب بھی نتائج وہی رہیں گے جو اب ہیں۔

پروفیسر صاحب جنہوں نے مذہب پر خطبہ ارشاد فرمایا ہے، غالباً بلکہ یقیناً رشنلسٹ ہی ہوں گے کیونکہ ہر "جدید انسان" رشنلسٹ ہونے کا مدعی ہے اور اہل مذہب کے مقابلہ میں رشنلزم کا اجارہ اس کا پیدائشی حق ہے۔ اب ذرا ان چند فقروں پر گہری نہ سہی ایک ہلکی سی تنقید (وہی تنقید جس کا وحی نے سدباب کر دیا تھا) کیجیے جو ان کی زبان مبارک سے خارج ہوئے ہیں۔

آپ کیمسٹری کے معلم ہیں، اور مذہب پر کلام فرما رہے ہیں۔ سب سے پہلے ان سے دریافت کیجیے کہ آپ نے مذہب کا کتنا مطالعہ فرمایا ہے؟ کون کون سی کتابیں ملاحظہ کی ہیں؟ کتنا وقت مذہبی مسائل پر غور و خوض کرنے میں صرف کیا ہے؟ اگر ان کے اخلاق (جنت دوزخ والے نہیں بلکہ ترقی پذیر اخلاق) میں صداقت کوئی چیز ہے تو وہ خود ہی اس بات کا اعتراف کر لیں گے جو ہم نے ان کا خطبہ پڑھ کر اخذ کی ہے، یعنی یہ کہ انہوں نے مذہب کا کچھ بھی مطالعہ نہیں کیا، صرف چند ایسے تنقیدی مضامین پڑھے ہیں جو بعض مغربی مصنفین نے زیادہ تر عیسائی مذہب کو پیش نظر رکھ کر لکھے ہیں، اور اس خارجی و سرسری مطالعہ پر بھی تفکر اور محققانہ غور و خوض کے لیے ان کو کچھ زیادہ وقت نہیں ملا ہے۔ اس کے بعد کس نے کہا تھا کہ آپ مذہب پر اظہار رائے فرمائیں؟ کیا ایک رشنلسٹ کا یہی کام ہے کہ وہ کسی ایسے مسئلہ پر اظہار خیال کرے جس پر اس نے کافی مطالعہ اور کافی غور و خوض نہ کیا ہو؟

آپ کا اسم گرامی حیدر خاں ہے۔ مسلمانوں کا سا نام۔ غالباً کوئی بھی یہ نام سن کر نہیں کہہ سکتا کہ آپ مسلمان نہیں ہیں۔ اس نام سے موسوم ہوتے ہوئے آپ فرماتے ہیں کہ "حق و صداقت کے حصول کا ذریعہ ہونے کی حیثیت سے وحی ناقابل اعتبار ہے" اس سے زیادہ صریح الفاظ میں قرآن اور رسالت

کی تکذیب اور کوئی نہیں ہوسکتی، اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ بیک وقت مسلمان بھی ہونا اور قرآن و رسالت کی تکذیب بھی کرنا اجتماع ضدین ہے۔ اب اگر آپ خود بھی اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں تو ریشنلسٹ ہونا تو درکنار کوئی صاحب عقل یہ بھی تسلیم نہ کریگا کہ آپ کے کاسہ سر میں دماغ موجود ہے۔ اور اگر آپ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ یہ اعتقاد قبول کرنے کے ساتھ ہی آپ اسلام سے خارج ہوگئے، تو آپ کو سب سے پہلے اپنے خارج از اسلام ہونیکا اعلان کرنا چاہیے تھا، اور اپنا وہ اسم گرامی بدلنا چاہیے تھا جس کی وجہ سے عرف عام کی بنا پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ آپ مسلمان ہیں۔ ریشنلزم کے اخلاق یعنی ترقی پذیر سائنس میں منافقت اور دھوکہ بازی تو شاید ابھی جائز نہ ہوئی ہوگی

آپ وحی کے متعلق اظہار رائے فرماتے ہیں، مگر یہ متعین نہیں کرتے کہ وحی سے آپ کی مراد کیا ہے؟ حدود متعین کرنے سے پہلے ایک مبہم چیز پر اظہار رائے کرنا کسی ریشنلسٹ کا کام نہیں ہوسکتا۔ ایسا ہی بلکہ اس سے زیادہ مبہم لفظ فوق الفطری ہے جس سے آپ نے وحی کی تعریف کی ہے۔ فاضل متکلم کیا اگر بولنے سے پہلے یہ تحقیق فرمالیتے کہ اسلام میں وحی کا مفہوم کیا ہے تو ان کو معلوم ہوجاتا کہ اس وحی کو تنقید کا سدباب کرنے کے لیے کبھی نازل نہیں کیا گیا بلکہ اس نے تنقید کو خود دعوت دی ہے اور اسی کی بدولت "جدید انسان" دور تنقید میں داخل ہوا ہے۔ نیز اگر وہ "لفظ فوق الفطری" کے حدود متعین کرتے تو یہ تحقیق کرنا کچھ مشکل نہ تھا کہ ایک معنی میں تو وحی فوق الفطری ہی نہیں ہے، اور دوسرے معنی میں اگر ہے بھی تو عقل اور تجربے اور مشاہدے کے ذریعہ سے اس کی صداقت جانچی جاسکتی ہے لہٰذا "جدید انسان" کا اس سے متاثر نہ ہونا اس کے غیر حق ہونے کی دلیل نہیں بلکہ اس بات کی دلیل ہے کہ "جدید انسان" "عقل اور سائنٹفک اسپرٹ" سے ابھی تک عاری ہے اور اس پر ابھی تک تعصب اور نفرت کے ان جذبات کا غلبہ ہے جو گذشتہ چار پانچ صدیوں میں معرکہ مذہب و سائنس سے، دراصل مسیحی پادریوں کے خلاف پیدا ہوئے اور پھر ہر اس چیز کے خلاف پھیل گئے جو مذہب کی طرف کسی طرح کی نسبت رکھتی ہو۔ اگر "جدید انسان" متعصب نہ ہوتا اور کھلے دل کے ساتھ ایک سائنٹسٹ کی طرح وحی کی جانچ کرتا تو ہرگز وہ خیالات ظاہر نہ کرتا جو اس نے ظاہر کیے ہیں، اور وحی اس کو متاثر کرنے میں کبھی ناکام نہ ہوتی ایک ریشنلسٹ کا مقام تو بہت اونچا ہے، اس سے ادنیٰ درجے میں بھی جس کو عقل سے کچھ بہرہ ملا ہو وہ اتنی معمولی بات تو

ضرور سمجھ سکتا ہے کہ جب کسی چیز کو دیکھنے اور جانچنے سے پہلے اس کے متعلق مخالفانہ رائے قائم کرلی جائے تو وہ آدمی کو متاثر کرنے میں خواہ مخواہ ناکام ہوگی، اور اس کا ناکام ہونا خود اس کے کسی قصور پر مبنی نہ ہوگا بلکہ قصور اس آدمی کا ہوگا جس نے پہلے ہی سے اپنے دل کے دروازے بند کرلیے۔

فاضل پروفیسر نے ان مذہبی نظریات کی کچھ بھی تشریح نہیں فرمائی جو قانون علیت کے نقطۂ نظر سے جانچ کے پہلے ہی حملہ پر پاش پاش ہوجاتے ہیں۔ اگر وہ مذہبی نظریات غیر اسلامی ہیں تو خواہ وہ پاش پاش ہوں یا نہ ہوں ہمیں ان سے کچھ مطلب نہیں اور اگر وہ اسلامی نظریات ہیں تو براہ کرم وہ ایک ہی نظریہ کو لیکر قانون علیت کے نقطۂ نظر سے جانچیں اور ہم کو بتائیں کہ کس طرح اس کے پرخچے اڑتے ہیں ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ تفصیل میں جانے کی جرأت نہ کریں گے لیکن اگر وہ کافی ہوشیار نہیں ہیں اور انہوں نے ایسی جرأت کی تو بہت جلدی یہ حقیقت کھل جائے گی کہ ان کو یا تو مذہبی نظریات کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں، یا وہ قانون علیت کے متعلق بہت کچھ غلط فہمی میں ہیں۔ علیگڈھ میں ترجمان القرآن کے متعدد ناظرین موجود ہیں۔ اگر وہ پروفیسر صاحب کو اپنے مدعا کی توضیح پر آمادہ کرسکیں تو ہم ان کے شکرگذار ہوں گے۔

اخلاق کو جنت اور دوزخ پر مبنی نہ ہونا چاہیے"۔ بالکل درست۔ مگر یہ کس نے آپ سے کہدیا کہ اسلام میں اخلاق جنت اور دوزخ پر مبنی ہے؟ جنت اور دوزخ اخلاق کے آخری نتائج ہیں نہ کہ اس کی اساس۔ اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ چوری کروگے تو جیل جاؤگے تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ چوری کا ایک برا فعل ہونا جیل پر مبنی ہے؟ یا اگر کسی کو یہ خبر دی جائے کہ سچ بولوگے تو تم کو عزت کا مقام دیا جائے گا، تو کیا اس سے یہ مطلب نکالا جاسکتا ہے کہ صداقت کی اساس مقام عزت ہے؟ جن لوگوں کی معلومات اس قدر سطحی ہیں، حیرت ہوتی ہے کہ وہ مذہب پر خطبہ دینے کی جرأت کیسے کرتے ہیں۔ فاضل خطیب نے اگر قرآن کا مطالعہ کیا ہوتا تو ان کو معلوم ہوتا کہ وہ خیر و شر کا ایک ایسا نظریہ پیش کرتا ہے، جس کی بلندیوں تک ان کے ائمۂ فرنگ کے دماغوں کی رسائی نہیں ہوئی۔ وہ خیر کو "معروف" کے نام سے موسوم کرتا ہے، اور شر کو منکر کہتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ نیکی اور بدی کی اساس انسانی فطرت پر قائم ہے فطرت کے مطابق ٹھیک ٹھیک چلنے کا نام نیکی ہے اور اس کا

انجام یہ ہے کہ انسان ترقی کرکے اس مرتبے پر پہنچ جائے جہاں سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہو اور کوئی چیز اسکی مرضی کے خلاف نہ ہو، لَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ۔ اور فطرت کے خلاف عمل کرنیکا نام بدی ہے اور اس کا انجام یہ ہے کہ انسان مقام انسانیت سے گر جائے اور تنزل کے اُس مرتبہ میں پہنچ جائے جہاں سب کچھ اسکی مرضی کے خلاف ہو اور کچھ بھی اس کے لیے مرغوب اور پسندیدہ نہ ہو۔

یہ بات اگر فاضل پروفیسر کو معلوم ہوتی تو وہ کبھی یہ نہ کہتے کہ "اخلاق کو ایک ترقی پذیر سائنس ہونا چاہیے اور عام انسانی ترقی کے ساتھ ساتھ بڑھنا چاہیے"۔ حکمت اخلاق کے اس بلند مرتبے پر پہنچنے کے بعد پروفیسر صاحب کو خود محسوس ہو جاتا کہ یہ اخلاقی نظریہ جس کو وہ بہت بلند سمجھ کر پیش فرما رہے ہیں کس قدر پست ہے۔ آپ اخلاق کو ناپائدار بنیادوں پر قائم کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی رائے میں اساس اخلاق کا استحکام اس کا عیب ہے، اور اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ جنتری کے ساتھ ساتھ دن بدلتا چلا جائے۔ آپ کا مطلب غالباً یہی ہے کہ کل جو چیز نیکی تھی ضرور نہیں کہ وہی آج بھی نیکی ہو، اور کل جو بدی تھی اس کو آج بھی بدی سمجھنا جمود اور تاریک خیالی ہے۔ انسانی ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاق کی ترقی کے معنی یہ ہیں کہ کل تک انسان جن باتوں کو انتہائی بداخلاقی سمجھتا تھا، آج اس کو وہی باتیں فخریہ برسرعام کرنی چاہئیں؛ اور کل جن افعال کو وہ نیکی سمجھتا تھا آج انہیں حماقت اور دقیانوسیت سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اخلاقی معراج کی یہ وہ انتہائی بلندی ہے جس تک ایک مادہ پرست انسان کا تصور پہنچ سکتا ہے۔ اس کے اخلاق کی بنیاد درحقیقت ہوائے نفس اور خواہشات و جذبات اور لذت پرستی و منفعت طلبی پر ہوتی ہے اور اس کی تائید میں وہ علمی انکشافات اور فکری ارتقاء اور تخیلات کے تحول و انقلاب اور مادی وسائل کی ترقی سے مدد لیتا ہے، اس لیے لامحالہ اس کے اخلاق کو ایک "ترقی پذیر سائنس" ہی ہونا چاہیے لیکن یہ حیوانیت کا مقام ہے انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ اخلاق کی اساس جبلت انسانی پر ہو، اور فطرت چونکہ ایک غیر متبدل شے ہے اس لیے فطری اخلاق کی اساس بھی غیر متبدل اور غایت درجہ مستحکم ہونی چاہیے۔ تغیرات احوال اور ترقیات علمی و عقلی سے اس کے مظاہر بدل سکتے ہیں، اس کے مواقع میں تغیر آسکتا ہے۔ اس کی صورتیں مختلف ہو سکتی ہیں، مگر اس کی بنیاد اپنی جگہ سے نہیں ٹل سکتی۔ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ۔ ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ۔